KitaabPoint.blogspot.com

صبح ہوگئی تھی۔ تھرمامیٹر ان انگلیوں کے بیچ کتنا خوب نظر آ رہا تھا۔ جھک کر میرے ہونٹوں کے بیچ سرکایا۔ پھر تھوڑی دیر بعد نکال کر اس کا جائزہ لیا اور سرہانے رکھی میز پر دھرے چارٹ پر کچھ لکھا اور جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے چلی گئی۔ بہرحال کمرے کی فضا اب یکسر بدل چکی تھی۔ جیسے شادابی کی ایک لہر دوڑ گئی ہو۔ اور کتنا اجالا پھیل گیا تھا۔ وہ جو ایک دھندلکا تھا وہ گھل گھلا گیا تھا اور اب صبح زیادہ اجلی دکھائی دے رہی تھی۔ کل تک تو مجھے صبح و شام کا' دن اور رات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ زندگی اور موت کے بیچ ایک نیم تاریک اذیت سے لبریز فضا میں رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ اسی عمل کے بیچ کسی وقت آپریشن کے عمل سے گزرا تھا۔ مگر اس ہنگام تو غشی کا عالم تھا۔ ہوش سمجھو کہ اب آیا تھا۔ تو ایک لمبی رات کے بعد یہ صبح چڑھی تھی۔ اور کیا صبح تھی۔ کتنے زمانے بعد اتنی اجلی صبح مجھ پر اتری تھی۔ پھر کتنی شاداب اور کتنی پرسکون۔ مجھے بیساختہ ان دنوں کی صبحیں یاد آ گئیں جب میں ابھی منن تھا۔ اتنی اجلی صبحیں تو انہیں دنوں دیکھنے میں آتی تھیں۔ ہر صبح یوں لگتا کہ زمین نے ابھی ابھی نیا جنم لیا ہے اور آسمان نے تازہ تازہ ظہور کیا ہے۔ ساری فضا کتنی پاکیزہ نظر آتی تھی' درخت تازہ دم دکھائی دیتے تھے۔ اور پرندے' ان کی تو پوچھو ہی مت' ویسے تو سارے دن ہی چہکتے رہتے تھے۔ کبھی اچھا خاصا شور مچانے لگتے تھے۔ مگر آخر کیوں' بس شوقیہ' مگر صبح کو تو یوں لگتا تھا کہ جیسے ان کے اندر کسی نے پارہ بھر دیا ہے۔ شاما چڑیا کی دم کس تیزی سے اوپر جاتی نیچے آتی۔ اور جنگلی کبوتر' ان کی تو غٹرغوں ہی سے ساری فضا ایک نرم دھیمی گونج سے بھر جاتی۔ طوطے الٰہی توبہ بہت شور مچاتے تھے۔ ویسے جب ہماری حویلی والے نیم پر اترتے تھے تو کیسی چپ سادھ لیتے تھے۔ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ ان ٹہنیوں کے بھیتر اور اوپر پھننگوں پر طوطے ٹکے ہوئے ہیں۔ ہرے میں ہرا مل جاتا تھا۔ وہ تو جب بھرا کھا کر اڑتے تھے تب پتہ چلتا تھا کہ یہ نیم جو ابھی اتنا سبز اور اتنا گھنا نظر آ رہا تھا وہ طوطوں کی وجہ سے تھا۔ ان کے اڑتے ہی ٹہنیاں کتنی چھدری نظر آنے لگتیں اور جیسے اب اتنی سبز نہیں ہیں۔ کیا سوچ کر ڈار کی ڈار ان ٹہنیوں کے بیچ آن اترتی تھی اور کیا سوچ کر ایک دم سے بھرا کھا کر اڑ جاتے تھے۔ پھر فضا میں ایک سبز ٹیڑھی میڑھی لکیر کھنچتی چلی جاتی۔ بس لگتا تھا کہ صبحیں بنی ہی طوطوں' میناؤں' بلبلوں اور کبوتروں کے لئے ہیں۔ آدمی تو ان سے بچی ہوئی صبح سے فیض یاب ہوتے تھے۔ پہلے تو وہی جاگتے تھے۔ وہی پہلے صبح کو برتتے تھے' بے دریغ صرف کرتے تھے۔ جتنی بچ جاتی تھی بعد میں جاگنے والی انسانی مخلوق کے صرفے میں آتی تھی۔ ایک صبح پہ کیا ہے' صبح و شام دونوں ہی جیسے خاص پرندوں کے اوقات تھے۔ شام بھی جیسے انہیں کے لئے پڑتی تھی اور صبح بھی جیسے بس انہیں کی خاطر چڑھتی تھی۔ ادھر شام پڑی اور ادھر پرندوں میں کھلبلی پڑی۔ کوے کتنے سراسیمہ ہو جاتے تھے اور مور اپنی لمبی لمبی نیلی نیلی گردنیں اٹھا کر کتنی گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھتے اور کتنی ہراس بھری آواز میں جھنکارتے۔ شام سے اتنا خوف جیسے شام نہیں پڑ رہی قیامت اٹھ رہی ہے۔ صبح کو اتنے خوش

KitaabPoint.blogspot.com

جیسے صبح عید ہو۔

میں کن صبحوں میں جا نکلا۔ وہ صبحیں تو ناپید ہی ہو گئیں۔ پھر بھی مجھے یوں لگ رہا تھا کہ یہ صبح جیسے صبحوں کے اسی قافلہ میں سے کوئی صبح ہے کہ بھٹک کر آج ادھر آ گئی ہے۔ بلکہ مجھے تو اگلی صبح بھی اسی تسلسل میں نظر آئی' اتنے فرق کے ساتھ کہ یہ صبح میں نے ہسپتال میں کی تھی اگلی گھر جا کر کی۔ اصل میں مجو بھائی اس اطمینان کی بعد کہ میری جان بچ گئی ہے مجھے زیادہ دیر ہسپتال میں رکھ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ آپریشن تو ہو ہی چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے حالت تسلی بخش قرار دے دی تھی۔ پھر وہ کیوں مجھے ہسپتال میں چھوڑتے۔ سارے دن بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ اس ڈاکٹ کو مل' اس ڈاکٹر سے رپورٹ لے' بس شام ہوتے ہوتے وہ مجھے ہسپتال سے نکال کر گھر لے آئے۔ میں نے گھر آ کر اطمینان کا سانس لیا۔ ہسپتال میں لاکھ خبر گیری ہو' مگر گھر پھر گھر ہوتا ہے۔ لگا کہ لمبا سفر کر کے ہرج مرج کھینچ کے گھر آیا ہوں۔ اس احساس نے کتنا سکون دیا۔

مجو بھائی نے بھی گھر پہنچ کر اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ ہسپتال میں تو وہ مستقل گھبرائے گھبرائے نظر آتے تھے۔ ڈاکٹروں نے جب حالت تسلی بخش قرار دے دی' اس کے بعد بھی ان کی گھبراہٹ میں بس واجبی واجبی ہی سا فرق آیا تھا۔ مگر گھر میں قدم رکھتے ہی جیسے ان کی ساری پریشانی دہلیز سے ادھر رہ گئی ہو۔ اچانک کتنے مطمئن نظر آنے لگے تھے۔ جیسے اب انہیں یقین آیا ہو کہ میں سچ مچ بچ گیا ہوں۔

''جواد میاں' یقین جانو کہ تم اللہ میاں کے گھر سے واپس آئے ہو۔''

''ہوں۔'' میں نے آہستہ سے تائیدی لہجہ میں ہوں کی اور چپ ہو گیا۔

''بڑی بے یقینی کی صورت تھی۔ ڈاکٹر کچھ زیادہ پر امید نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے کتنا پوچھا۔ کوئی واضح جواب نہیں دے رہا تھا۔ بس یہی کہ آپریشن کے بعد پتہ چلے گا۔ نازک آپریشن تھا۔ گولی بھی کہاں جا کر لگی تھی اور پتہ ہے میں کیا سوچ رہا تھا۔''

''کیا؟''

''یہی کہ یار میں تو اکیلا رہ جاؤں گا۔''

''اکیلے۔'' میں مسکرایا ''مجو بھائی آپ کے دوستوں' واقف کاروں' فدائیوں کی تو قطاریں لگی ہوئی ہیں۔''

''ہاں وہ بھی ہے۔ مگر یار..... بس تم سمجھ نہیں سکتے اس بات کو۔''

میں اس بات کو اپنی حد تک تو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ لے دے کے اب اپنے لئے مجو بھائی ہی رہ گئے تھے۔ باقی اور جن شرفاء سے

KitaabPoint.blogspot.com

ربط وضبط تھا وہ بھی مجو بھائی ہی کے واسطے سے تھا۔ مگر کیا میں بھی مجو بھائی کے لئے اسی طرح ناگزیر ہوں۔ کم از کم اس سے پہلے میں یہ تصور نہیں کر سکتا تھا۔ یہی سمجھتا تھا کہ منجملہ احباب میں بھی ہوں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ہم دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔

''مگر خیر خدا نے کرم کیا۔ اللہ میاں کو میری حالت پہ رحم آ گیا۔ میرے خیال میں اللہ میاں کو پہلی مرتبہ مجھ پر تھوڑا رحم آیا ہے۔'' یہ کہہ کے مجو بھائی ہنسے۔ پھر اچانک ان کا موڈ ہی بدل گیا ''لاحول ولاقوۃ ڈاکٹر نے تو تاکید کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ آرام کرنا ہے زیادہ بولنا نہیں ہے۔ دوسرے بھی زیادہ باتیں نہ کریں تاکہ مریض کم بولے۔ تو خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہئے۔'' اور اسکے ساتھ ہی نعمت خاں کو آواز دی ''نعمت خاں۔ او میاں نعمت خان۔''

نعمت خان کچن سے نکل کر لپک کر آیا ''جی صاحب۔''

''یار تم نے کمرے کی تھوڑی صفائی کر لی ہوتی۔ جواد میاں کا بستر ذرا جھاڑ جھوڑ کے قرینے سے بچھا دیا ہوتا۔''

''جی میں نے سب کر دیا ہے۔ بس آپ صاحب جی کو لٹا دیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ وہ تو میں لٹائے دیتا ہوں۔ مگر برابر میں ایک میز رکھ دو۔ اور یار کوئی گلدان نہیں ہے۔ خیال نہیں آیا کہ تھوڑے پھول رستے میں سے لے لیتا۔ اور دیکھو جواد میاں کے لئے دلیا تیار کر لو۔''

بس اسی قسم کی بہت سی باتیں ایک سانس میں کر ڈالیں اور کرتے چلے گئے۔ پھر مجھے سہارا دے کر لٹایا اور خود کمرے کا ایک نظر جائزہ لے کر صفائی ستھرائی پر جت گئے۔ نعمت خاں تھوڑی ہی دیر میں دلیا لے کر آ گیا۔ مجو بھائی کی نگرانی میں میں نے دلیا کھایا۔ اس کے فوراً بعد مجو بھائی نے مجھے جلدی جلدی کئی ایک قسم کی دوائیں کھلا پلا ڈالیں اور ہدایت کی ''بس اب تم سو جاؤ۔''

شاید انہیں دواؤں میں کوئی سونے کی بھی دوا تھی۔ جب ہی تو مجھے اتنی جلدی نیند آ گئی۔ پھر شاید یہ بات بھی تھی کہ آج میں اپنے گھر میں سو رہا تھا۔ احساس ہو رہا تھا کہ ایک زمانے بعد باہر خراب و خستہ ہو کر اپنے گوشے میں واپس آیا ہوں۔ اپنا کمرہ اپنے در و دیوار اپنا بستر کتنی آسودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ بس جلدی ہی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ آدمی گھر سے باہر بیشک ریشم و مخمل کے نرم گرم بستر میں ساری آسائشوں کے ساتھ آرام کرے مگر اپنے گوشے میں لمبی تان کر سونے میں جو راحت ہے اس کی بات ہی اور ہے۔ تو میں جلدی ہی سویا اور اس شان سے کہ سمجھ لو گھوڑے بیچ کر سویا۔ پھر صبح ہی کو آنکھ کھلی۔ ہاں صبح کو آنکھ جلدی کھل گئی۔ بس موذن لاؤڈ سپیکر پہ ابھی کھنکھار رہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ ایسے کھلی کہ نیند بالکل رفو چکر ہو گئی۔ کتنی دیر تک میں آنکھیں موندے پڑا رہا کہ شاید پھر آنکھ لگ جائے۔ آخر اتنی سویرے میں اٹھ کر کیا کروں گا۔ ابھی تو بہت اندھیرا تھا۔ اجالے کی ذرا جو رمق ہو۔ مگر خیر

KitaabPoint.blogspot.com

مجھے لمبا انتظار کھینچنا نہیں پڑا۔ گاڑھا اندھیرا چھدرا ہوتا چلا گیا۔ ادھر چڑیوں نے بولنا شروع کر دیا۔ اس صبح مجھے احساس ہوا کہ ہمارے گھر کے آس پاس اتنی چڑیاں ہیں۔ لگتا تھا کہ کہیں پاس ہی لکھوکھا چڑیاں ہیں کہ ایک دم سے جاگ پڑی ہیں اور شور مچانا شروع کر دیا ہے۔ اور ہاں کتنی خوشی ہوئی یہ سوچ کر کہ کوئل کی آواز ہمارے گھر تک آتی ہے۔ پھر یہ کہ شہر میں یہ آواز موسم کی پابند نہیں ہے۔ ہمارے ادھر تو گرمیوں گرمیوں سنائی دیتی تھی۔ ادھر برسات ختم ہوئی اور ادھر کوئل کی آواز غائب۔ پھوپھی اماں اس کی توجیح یوں کرتیں کہ کوئل پہاڑوں میں واپس چلی گئی۔ ان کے حساب سے کوئل کا اصلی ٹھکانہ پہاڑ تھے۔ آموں پر بور آنے کے ساتھ پہاڑوں سے اتر کر ہمرے باغوں میں آتی' گرمیوں میں شروع ہو کر برسات کے ختم تک کوکتی رہتی۔ برسات کو اپنی آخری کوک کے ساتھ رخصت کرتی اور پہاڑوں میں واپس چلی جاتی۔ مگر اس شہر میں یوں احساس ہوتا کہ کوئل نہ کہیں سے آتی ہے نہ کہیں جاتی ہے۔ اس لئے بے موسم بھی اس کی کوک سنی جا سکتی ہے۔

میں نے آہستہ سے دائیں سے بائیں' پھر بائیں سے دائیں کروٹ لی۔ مگر کسی کل چین نہیں آیا۔ نیند پوری ہو چکی تھی اور اب بستر میں لیٹے رہنا ناگوار گزر رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجو بھائی کے پلنگ پر نظر ڈالی۔ بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے ہمت کی۔ آہستہ سے پلنگ سے اتر اٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ چل کر بالکنی میں جا پہنچا۔ کمرے میں تو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ یہ تو اچھا خاصا اجالا ہو چلا تھا۔ اجلا اجلا دھندلکا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ دور چوراہے پر کوئی آدمی چلتا پھرتا تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ آدمی نہ سواری۔ ہاں ایک کتا ایک کتیا کے ساتھ چہلیں کر رہا تھا۔ اور وہ کتیا اس سے کتنی اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ مگر جلدی ہی جھاڑو دینے والے آن پہنچے۔ ان کی جھاڑو نے ان کی خوشی میں کھنڈت ڈال دی۔ پھر کہیں سے تیسرا کتا آن نکلا۔ ایک اور کھنڈت۔ بے مزہ ہو کر وہاں سے وہ سرک ہی گئے۔

چوراہے کے بیچوں بیچ جو چبوترے میں گڑا ایک کھمبا کھڑا تھا اس کی روشنی اب بجھ چکی تھی۔ دکانیں ابھی بند تھیں۔ ہاں وہ جو چائے والے کی دکان تھی اور جو ہماری بالکنی سے صاف نظر آتی تھی کھل گئی تھی۔ چولہا بھی گرم ہو گیا تھا۔ گاہک ابھی کوئی نمودار نہیں ہوا تھا۔ بس دکاندار اپنے ہی طور پر کچھ سٹر پٹر کرتا نظر آ رہا تھا۔

اچانک ایک سمت سے ایک کار نمودار ہوئی اور ہارن دیتی ہوئی تیزی سے دوسری سمت چلی گئی۔ بس اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ دور کی سڑکوں پر ایک دم سے بہت سی رکشائیں' ٹیکسیاں' بسیں' موٹریں نکل پڑی ہیں اور شور کرتی ہوئی دوڑ رہی ہیں۔

نعمت خان نے ایک کرسی لا کر رکھ دی۔ ''صاحب' آپ کھڑے کھڑے تھک جائیں گے۔ تھکنا آپ کو نہیں چاہئے۔ کرسی بچھا دی ہے۔ بیٹھ جائیے۔''

KitaabPoint.blogspot.com

میں بیٹھ گیا۔ نگاہیں اسی طرح دور چوراہے کی سمت میں دیکھتی ہوئیں۔ چوراہا بھی اب ساکن اور خاموش نہیں رہا تھا۔ لوگ چلتے پھرتے نظر آنے لگے تھے۔ ابھی ابھی ایک بس کھمبے سے دائیں ہاتھ والے سٹینڈ پر آ کر رکی تھی۔ اور وہاں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک سواری آن کھڑی ہوئی تھی اسے لے کر تیزی سے آگے چلی گئی۔ اب اس سٹینڈ پر کئی ایک لوگ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ایک رکشا کسی سمت سے آ کر وہاں رکی۔ اور ایک شخص لپک کر اس میں بیٹھا۔ رکشا تیزی سے سٹارٹ ہوئی اور شور کرتی ہوئی مین روڈ کی طرف چلی گئی۔

سکول جانے والے بچے' کالج جانے والی لڑکیاں' دفتر جانے والے بابو لوگ رنگ رنگ کی مخلوق مختلف گلیوں سے نکل کر امنڈ رہی تھی۔ کوئی بس سٹینڈ پر بس کے انتظار میں۔ کوئی رکشا کا منتظر۔ اور ہاں اسکول کے بچے بچیاں اور لڑکیاں اپنی اپنی درسگاہ کی وین کی منتظر تھیں۔ اپنی اپنی سکول اور کالج کی پوشاکوں میں کتنی خوش اور شاداب نظر آ رہی تھیں۔

تو اب صبح اپنے عروج پر تھی۔ اور میں حیران بھی اور خوش بھی کہ ایسے خراب زمانے میں اتنی خوشگوار' اتنی شاد آباد صبح' جیسے شہر کو کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ وہی بھلے دنوں کا جیتا جاگتا شہر اور اس کی جیتی جاگتی صبحیں۔ تو گویا اس شہر کی صبحیں ابھی تک زندہ و سلامت تھیں' ابھی تک گزرے دنوں کی صبحوں کے تسلسل میں چڑھ ڈوب رہی تھیں۔ یہ تو نیک علامت ہے' میں نے سوچا' ابھی تک اس شہر میں چڑیاں اسی طرح منہ اندھیرے چہکنا شروع کر دیتی ہیں' لڑکیاں اپنی اجلی اجلی پوشاکیں پہن کر اپنے اپنے کالجوں کی وین میں لدی پھندی اپنے کالجوں کی طرف جاتی نظر آتی ہیں' بچے گلے میں بیگ ڈالے اپنے اپنے سکول کے لئے رواں دواں نظر آتے ہیں' کتنے پیدل' باقی ٹولیوں کی ٹولیاں' بسوں' ویگنوں' رکشاؤں' میں لدی پھندی۔ پھر تو اس شہر کی بحالی صحت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یا شاید جیسے میں زندگی اور موت کی کشمکش سے گزر کر' لمبی اذیت سے نکل کر یہاں خوش کھڑا ہوں یہ شہر بھی اپنی اذیت کے دن گزار کر اب شفا پا چکا ہے۔ خیر اگر ایسا نہ بھی ہو' میں نے سوچا' اتنا تو طے ہے کہ اس کی صبحوں کی پاکیزگی پر ابھی کوئی آنچ نہیں آئی ہے۔ یہ نیک فال ہے۔ ایک شہر کی جب تک صبحیں سلامت ہیں اس کی سلامتی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ دن اور رات کے باقی پہر کسی حال میں ہوں' صبح کے پہر کو بچا کر رکھنا چاہئے۔ خوشگوار صبح کسی ڈوبتے شہر کا آخری سہارا ہوتی ہے۔ جب صبحیں بھی ڈوب جائیں تو.....

''یار تم یاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔'' مجو بھائی سر پہ آن کھڑے ہوئے ''میں سمجھ رہا تھا کہ باتھ روم میں ہوں گے' حیران اور پریشان تھا کہ باتھ روم میں اتنی دیر۔ کیا ہو گیا' چلو اٹھو' منہ ہاتھ دھوؤ' ناشتہ کرو' دوا میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔''

صبح سے میں سیر ہو چکا تھا۔ انہوں نے کہا' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ باتھ روم گیا۔ آہستہ آہستہ ہاتھ منہ دھویا۔ تازہ دم ڈائننگ ٹیبل پہ آ

KitaabPoint.blogspot.com

بیٹھا جہاں مجو بھائی پہلے سے بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ صبح سے ملاقات کے بعد میں کتنا ہشاش بشاش ہو گیا تھا۔ میں اپنے حساب سے شفایاب ہو چکا تھا۔ میرے ساتھ شہر بھی۔

مجو بھائی مجھے دیکھ کر مطمئن نظر آ رہے تھے۔ پوچھنے لگے "طبیعت اب کیسی ہے؟"

"بس صبح کے ساتھ طبیعت بحال ہو گئی۔ مجو بھائی اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ اپنے آپ کو آزاد سمجھیں۔"

"پابند میں کب تھا۔"

"لو میری وجہ سے تو آپ کے پاؤں میں اچھی خاصی بیڑیاں پڑ گئی تھیں۔"

"کون کہتا ہے۔"

"میں کہتا ہوں۔ اس سے پہلے آپ کبھی زندگی میں اتنے بندھ کر بیٹھے تھے۔ آپ کے کتنے کام' کتنے پروگرام میری وجہ سے کھوٹے ہوئے۔"

"اماں ہمارے کونسے کام' کونسے پروگرام ہیں۔ اگر پروگرام بنا کر چلتے تو پھر ہماری زندگی کسی اور طرح بسر ہوتی۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ خدا واسطے کے کام جو آپ اپنی جان کے ساتھ لگائے رکھتے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ خیال بیچارے آقا حسن کا ہے۔ ان کا تو بیٹی کا معاملہ ہے۔"

مجو بھائی نے ٹھنڈا سانس بھرا "جواد میاں' کیا پوچھتے ہو اس معاملہ میں ہم بہت ذلیل ہوئے۔ البتہ ایک فائدہ ہوا۔"

"وہ کیا۔"

"لکھنو اور میرٹھ دونوں کا بھاؤ معلوم ہو گیا۔ مگر یار' یہ تمہارے میرٹھ والے' اور ایک میرٹھی اوپر سے کمبوہ' کڑوا کریلا نیم چڑھا۔ میں مان گیا انہیں۔"

"میں نے آپ سے کیا کہا تھا۔ بہر حال یہ بتائیے' اب وہ کیا کہتے ہیں۔"

"ارے یار بھائی بہن دونوں پٹھے پہ ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتے۔ اور باجی اختری' وہ عورت تو بالکل ماش کا آٹا بنی ہوئی ہے۔"

"اور لکھنو والے؟"

"اماں پہلے تو میرا حال پوچھو۔ پہلے وہ لوگ ان میرٹھوں میں عیب نکالتے تھے اور میں پردہ ڈالتا تھا۔ اب وہی عیب میں نکالتا ہوں اور وہ پردہ ڈالتے ہیں۔ میں اب گھما پھرا کر جتاتا ہوں کہ یہ لوگ تو واقعی کمبوہ ہیں اور واقعی قینچی والے ہیں۔ مگر بشو بھابی ایک کان

KitaabPoint.blogspot.com

سنتی ہیں' دوسرے کان اڑا دیتی ہیں۔ اب تو اقن صاحب کو بھی توصیف میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"اماں پھر یہی ہوگا کہ میں کسی دن انہیں صاف صاف بتا دوں گا کہ ہم نے تو لاسہ لگایا تھا مگر پنچھی دانہ چگ کر اڑ گیا۔"

اتنے میں نعمت خان آن نازل ہوا۔ اس نے جلدی جلدی ناشتہ لگایا۔ پھر رک کر کھڑا ہو گیا۔ مجو بھائی نے اسے غور سے دیکھا

"کہو نعمت خان' کیا بات ہے۔"

"مجو بھائی جی' دو عرضیں ہیں۔"

"یک نہ شد دو شد۔ اچھا بتاؤ' وہ کیا دو عرضیں ہیں۔"

"پہلی عرض تو یہ ہے صاحب جی کہ یہ جو ہمارا دروازہ ہے اس میں ایک چھوٹا سا چوکور خانہ کھلوا کے جالی لگوا دو۔"

مجو بھائی نے معنی خیز نظروں سے نعمت خان کو دیکھا "اچھا لگوا دیا۔ مگر اس کا فائدہ کیا ہوگا۔"

"پھر جی اچانک تو نہیں پکڑے جائیں گے۔ پتہ تو چل جائے گا کہ آنے والا ہے کون ہے؟"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"صاحب جی' آپ تو جانتے ہی ہیں کہ زمانہ کیسا خراب جا رہا ہے۔ وارداتیں کرنے والوں نے اب نیا چکر چلایا ہے۔ کہ آ کے دوازے کی گھنٹی بجاتے ہیں۔ دروازہ کھولو تو داخل ہو کے سب گھر والوں کو پستول دکھا کے رسیوں سے باندھا' پھر سارا مال سمیٹا' پھر گولی ماری' اور یہ جا وہ جا۔ تو جی دروازہ کھولنے سے پہلے یہ تو دیکھ لیا جائے کہ ہے کون۔"

"نعمت خان' تم کہاں کہاں سے کیا کیا بے سر پیر کی سن کے آتے ہو۔"

"بے سر پیر کی نہیں جی۔ برابر والی گلی میں جو حاجی صاحب ہیں ان کے گھر میں ایسے یہ گھس کے آئے تھے وہ۔"

"حاجی صاحب تو دولتمند آدمی ہیں۔ ڈاکوؤں کو کسی نہ کسی دن کسی نہ کسی راستے ان کے یہاں آنا ہی تھا۔ نعمت خان' ڈاکو احمق نہیں ہوتے۔ انہیں ہماری اوقات کا پتہ ہے۔ وہ یہاں آ کر کیوں اپنا قیمتی وقت ضائع کریں گے۔" "مجو صاحب جی' ان ڈکوؤں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ضروری تو نہیں کہ ڈاکہ ڈالنے ہی آئیں۔ کبھی کبھی ڈاکہ نہیں بھی ڈالتے۔ کلمہ پڑھوایا' گولی ماری' اور دفع ہو گئے۔ کئی بیری ایسا ہوا ہے تو صاحب جی' دوسری عرض یہی ہے۔"

"وہ کیا ہے۔"

KitaabPoint.blogspot.com

''میرا کلمہ صحیح کرادو۔''

''گویا تمہارا خیال ہے کہ اگر تم نے کلمہ صحیح سنا دیا تو وہ تمہیں بخش دیں گے واہ نعمت خان واہ۔''

''نہ بخشیں' موت اور زندگی تو جی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر آدمی کا کلمہ تو صحیح ہونا چاہئے۔ جانا ہی ٹھہر گیا ہے۔ تو کلمہ صحیح پڑھ کر تو جائیں۔''

''نعمت خان' عقل کے ناخن لو۔ یار لوگ بے سر پیر کی اڑاتے ہیں۔ تم ان پر اعتبار کر لیتے ہو۔''

''نہیں جی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ تو کئی راتوں سے ہسپتال میں تھے۔ مجھ سے پوچھو۔ اکیلا تھا' کئی بیری لگا کہ کوئی دروزے پہ ہے۔ بلکہ ایک دفعہ تو گھنٹی بھی بجی تھی۔ مگر میں نے بھی کچی گولیاں تو نہیں کھیلی ہیں۔ دم سادھ کے پڑا رہا۔ ہنکارا بھی نہیں بھرا۔ دروزہ کھولنا تو دور کی بات ہے۔''

نعمت خان بولے جا رہا تھا اور میں اس کا منہ تک رہا تھا۔ کتنا خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ میری بشاشت بھی غائب تھی۔ صبح کتنی سہانی چڑھی تھی' باہر بھی' میرے اندر بھی۔ اور اب وہ کس طرح ڈوب رہ تھی۔

''مجو بھائی۔'' میں تھوڑا جھجکا مگر پوچھ ہی لیا ''گولی واقعی نکل گئی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' مجو بھائی نے گھور کے مجھے دیکھا ''تمہارا خیال ہے کہ گولی ابھی تک تمہارے اندر گھسی بیٹھی ہے۔ یہ تو تم نے لغجو نچوں والی بات کی۔''

''میں اپنے اطمینان کے لئے پوچھ رہا تھا۔''

''بندۂ خدا' آپریشن کس بات کا ہوا تھا۔ اسی خاطر ہوا تھا۔''

''اچھا۔ ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے سے کیا مطلب۔ تمہیں شاید ابھی تک اعتبار نہیں آیا ہے۔ کاغذ پر لکھ کر دے دوں یا ڈاکٹروں سے لکھوا کر لا دوں۔''

''نہیں مجو بھائی میرا مطلب یہ نہیں ہے۔''

''میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب گولی نکل گئی ہے تو پھر کیا چیز ہے جو میرے اندر رڑکتی رہتی ہے۔''

''کچھ دنوں یہی احساس رہے گا۔ آخر گولی تھی' غلہ تو نہیں تھا۔ آرام کرو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ چند دنوں بعد یہ احساس بھی نہیں رہے گا کہ کبھی گولی لگی تھی۔ مگر شرط یہ ہے کہ آرام کرو۔ مکمل آرام' ڈاکٹر نے سخت تاکید کی ہے کہ دفتر نہ جائیں' باہر نہ نکلیں۔''

KitaabPoint.blogspot.com

''آرام ہی کر رہا ہوں۔ باہر نکلنے کا مجھے کونسا شوق ہے۔ آپ ہی لئے لئے پھرتے تھے۔ رہا دفتر تو وہاں سے فی الحال چھٹی لے ہی رکھی ہے۔''

''ہاں بس آرام۔''

''یہی تو تعجب ہے کہ آرام کر رہا ہوں۔ پھر بھی کوئی چیز اندر رڑکتی رہتی ہے۔ جیسے گولی کہیں بہت اندر اتر گئی ہو اور رڑک رہی ہو۔''

''معلوم ہے کیا چیز رڑکتی ہے۔''

''کیا؟''

''دماغ۔''

''دماغ؟''

''ہاں دماغ۔ یہ تمہارا دماغ ہے جو رڑکتا رہتا ہے۔ بھلے آدمی دماغ بھی آرام چاہتا ہے۔ اسے آرام نہیں کرنے دو گے تو وہ ستائے گا۔ بلکہ ستا رہا ہے۔ کم از کم اس حال میں تو سوچنے سے باز رہتے۔ مگر تم تو اس وقت بھی جب تم بے سدھ پڑے تھے۔ اس قبیح حرکت سے باز نہیں آئے۔ تمہارا دماغ ہے۔ یا شیطان کا چرخہ ہے۔ ہر وقت چلتا رہتا ہے۔''

''مجو بھائی' اس وقت مجھے سوچنے کا ہوش تھا۔ میرے ساتھ میرا دماغ بھی نڈھال تھا۔ آوارہ خیالوں اور یادوں نے غریب پر یلغار کر رکھی تھی۔''

''پتہ ہے تم بیہوشی میں کیا کیا بکار رہے تھے۔ جیسے دنیا کے سارے بر باد شہر تمہارے دماغ میں گھس کر فتور پیدا کر رہے ہوں۔''

''اچھا؟ کیا بکار رہا تھا' مجھے تو یاد نہیں۔''

''ہاں اب تمہیں یاد نہیں ہے۔ اس وقت تو لگتا تھا کہ تمہیں بہت کچھ یاد ہے۔ دنیا زمانے کی باتیں۔ ہاں یاد آیا۔ تم بکارتے بکارتے کہنے لگے' ہاں مجو بھائی' وہ جو میں بیچ میں سے بھول گیا تھا' وہ بات اب یاد آئی۔ وہ بات یہ تھی کہ ..... مگر ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ تمہیں زیادہ باتیں نہ کرنے دی جائیں تو میں نے تمہیں روک دیا کہ یار' سو جاؤ۔ پھر سنانا۔'' مجو بھائی ہنسے ''ہاں اب بتاؤ' وہ کیا بات تھی۔''

''اچھا میں نے ایسا کہا تھا۔'' میں سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑا سا پریشان بھی ہوا کہ کہیں پھر کچھ غلط سلط تو نہیں کہہ گیا۔ مجو بھائی تو بات کو پکڑ لیتے ہیں۔ میں نے بہت یاد کرنے کی کوشش کی۔ مگر یاد نہ آیا کہ کونسی بات ایسی یاد آئی تھی جو میں مجو بھائی کو سنانا چاہتا تھا۔ ''مجو

KitaabPoint.blogspot.com

بھائی' اس وقت تو بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ مگر اب..... ۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ پھر یاد کر کے بتانا' اس وقت ذہن پہ زور مت ڈالو۔" یہ کہتے کہتے نعمت خان کو آواز دی۔ نعمت خان دوڑا آیا۔

"دیکھو نعمت خاں' میں چل رہا ہوں۔ تم جواد میاں کا خیال رکھنا' تھوڑی دیر میں یخنی پلا دینا۔ کھانے میں شوربہ اور پھلکے کے بکل۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "یار' یہ غازی صاحب نے مجھ سے برے چمٹے ہیں۔ میں نے مروت میں بس رسمی سے چند فقرے ان کی شان میں کہہ دیئے تھے۔ وہ سمجھ بیٹھے کہ میں بھی باجی اختری اور توصیف کی طرح ان کا مرید بن گیا ہوں۔ آج وہ کوئی معرکہ کا خطبہ دے رہے ہیں۔ اصرار ہے کہ آ کر سنو۔"

میں چونکا اور حیرت سے مجو بھائی کو دیکھا "آپ غازی صاحب کو سننے جا رہے ہیں۔"

"کیا کریں۔ گلے جو پڑ گئے ہیں۔ مروت میں یہ کام بھی کرنا پڑے گا۔ رفیق صاحب سے کہوں گا کہ اس مشکل وقت میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ ان کے ساتھ جاؤں گا تو جلدی اٹھ کر آنے میں آسانی رہے گی۔ وہ تو اس کام میں ماہر ہیں۔ بس غازی صاحب کو اپنی صورت دکھانی ہے۔ جھانکوں گا اور آ جاؤں گا۔"

"پھر جائیں۔ اللہ آپ پہ رحم کرے۔"

مجو بھائی بس اسی طرح کی عذر معذرتے کرتے نکل گئے۔ بات اصلی یہ تھی کہ مجو بھائی گھومنے پھرنے والے آدمی۔ میری وجہ سے ان کے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی تھی۔ بیچارے ہسپتال میں میری پٹی سے لگے بیٹھے رہے۔ مجھے اب ہسپتال سے رہائی ملی تھی۔ تو انہیں بھی گویا رہائی مل گئی۔ تو آج انہیں کسی نہ کسی بہانے گھر سے نکلنا ہی تھا۔ میرے ساتھ قید ہو کر تو گھر میں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ نعمت خان دیکھ بھال کے لئے گھر میں موجود تھا۔ پھر انہیں فکر کس بات کی تھی۔ ادھر میں نے بھی ان کے جانے کے بعد اطمینان کا سانس لیا۔ اپنے آپ سے جو نئی قسم کی ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس میں وہ مستقل مخل ہو رہے تھے۔ یہ ملاقات خلوت مانگتی تھی۔ وہ میسر نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ اب میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ موت و زیست کی کشمکش سے تو میں اب نکل آیا تھا۔ اس کشمکش نے تو واقعی مجھے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ نہ زندوں میں تھا نہ مردوں میں۔ جانے جان کہاں اٹکی رہ گئی تھی کہ نکلی نہیں۔ ویسے کسر تو کوئی رہ نہیں گئی تھی۔ اب حال اچھا تھا۔ مگر وہ جو خوشگوار احساس تھا کہ میں بالکل شفایاب ہو گیا ہوں وہ تو بس دو صبحوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ دوسری صبح بھی جو گھر واپسی کے بعد چڑھی تھی میں کتنا ہشاش بشاش اٹھا تھا۔ جیسے پہلے کی طرح صحت مند ہو گیا ہوں' بلکہ پہلے سے زیادہ۔ لیکن صبح کے ساتھ یہ کیفیت بھی زائل ہوتی چلی گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ یہ کیفیت اتنی جلدی زائل کیسے ہو گئی۔ پہلے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اتنی جلد

KitaabPoint.blogspot.com

شفا کا یہ احساس پیدا کیسے ہوا۔ ممکن ہے اس خوشگوار ذہنی کیفیت کے جو شفا کے خیال سے پیدا ہوئی تھی زائل ہونے میں نعمت خان کا بھی ہاتھ ہو جس نے موقعہ پاتے ہی مجو بھائی سے آنکھ بچا کر مجھے ادھر ادھر کی تشویشناک خبریں یا افواہیں سنا ڈالی تھیں۔ بہر حال اس روشن صبح کے زوال کے ساتھ ہی مجھے اپنے اندر بھی صبح کے زوال کا احساس ہونے لگا۔ جیسے گئی ہوئی ذہنی کیفیت واپس آنے لگی ہو۔ جیسے پھر اس رو میں بہنے لگا ہوں۔ مگر میں جلدی ہی چوکنا ہو گیا سوچا کہ ایسا نہ ہو کہ پھر اسی رو میں اس طرح بہتے چلے جاؤ۔ اور پھر کہیں بالکل ہی نہ بہہ جاؤ۔ اپنے آپ کو اکٹھا کرو' سنبھالو' مدافعت کی طاقت پیدا کرو۔ پراگندہ خیالوں اور آوارہ یادوں پر بند باندھو۔ تو واقعی خلوت اس وقت میری ضرورت تھی۔ اور ہاں اب جو اچانک مجو بھائی نے ایک نیا شقلہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو یہ کہہ کر نبٹ گئے کہ ذہن پہ زور مت ڈالو۔ پھر کبھی جب وہ بات یاد آ جائے۔ سنا دینا۔ مگر میں تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کیا واقعی میں نے اپنے اس عالم میں مجو بھائی کے سامنے کچھ اگل دیا تھا۔ مجو بھائی گول کر گئے۔ بتایا نہیں کہ میں نے کیا اگلا تھا۔ بلکہ یہ ظاہر کیا کہ جیسے اگلنے لگا تھا مگر اگلا نہیں۔ مگر' میں نے اپنے آپ کو ٹوکا' میرے پاس اگلنے کے لئے کیا ہے۔ شاید یہ بھی مجو بھائی کی کوئی چال تھی اور میں نے مجو بھائی سے کہی تھی۔ تو اس سب کے لئے اپنے آپ کو ٹٹولنے کے لئے خلوت اس وقت میری ضرورت تھی۔ مگر وہ نصیب کہاں ہوئی۔ مجو بھائی رخصت ہوئے ہی تھے کہ مرزا صاحب آن وارد ہوئے۔ ''ارے بھائی' یہ تم کس مصیبت میں پھنس گئے۔''

''آیئے مرزا صاحب۔'' میں سنبھل کر بیٹھنے لگا۔

''نہیں نہیں لیٹے رہو۔ میں تو بس تمہاری خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔ رفیق صاحب سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔ انہوں نے بتایا۔ میاں میں تو حق دق رہ گیا۔ گھر میں جا کر بتایا تو وہ بھی سناٹے میں آ گئیں۔ صبح سے تک تک کر رہی تھیں کہ جاؤ' خیریت معلوم کر کے آؤ۔ تو بھائی کیسے ہو۔''

''اب اچھا ہوں۔''

''خدا کا شکر ہے۔ جان بچ گئی۔ بس آرام کرو۔ انشاء اللہ چند دن میں بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ مگر یہ واقعہ ہوا کیسے۔''

اب مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ یعنی اس مرحلہ سے نکل آیا تھا کہ دنیا جہان کی باتیں یاد آ رہی تھیں اور یہ ابھی کی بات یاد نہیں آ رہی تھی اور یاد اگر آتی بھی تھی تو اس طرح جیسے صدیوں پہلے کوئی حادثہ گزرا ہو۔ مگر اب میں تمام و کمال اس واقعہ کو سنا سکتا تھا۔ مگر نقاہت زیادہ بات کرنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ پھر یہ بھی احساس کہ کیا بار بار اس واقعہ کو دہرانا۔ بہر حال مرزا صاحب نے بھی رسماً پوچھا تھا۔ رسمی مزاج پرسی کے فوراً ہی بعد انہوں نے اپنی الھا شروع کر دی۔ ''اس شہر میں اب ہم جیسوں کا گزارہ نہیں۔ جو

KitaabPoint.blogspot.com

کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھنے کے لئے کہاں سے جگر لائیں۔ میاں اب ہم مرنا چاہتے ہیں۔ کوئی یقین ہی نہیں کرتا۔ سمجھتے ہیں کہ بڑھاپے میں چل بچل ہو گیا ہے۔ نہیں میاں نہیں۔ میں بقائمی ہوش وحواس کہہ رہا ہوں۔ ارے ہم چلن بار تو پہلے ہی تھے۔ عمر تو پوری ہو چکی ہے نا۔ آخر اور کتنا جئیں گے۔ بہت دیکھ لی دنیا۔ اب دنیا کا جو حال ہے اسے دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔ تو میاں اب ہم واقعی مرنا چاہتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ مرزا صاحب۔" میں نے یونہی رسماً ایک فقرہ کہہ دیا۔

"لو تم بھی اعتبار نہیں کرتے۔ نہیں میاں نہیں۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ مگر موت اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ ایک وہ تھے کہ جب دیکھا دنیا رہنے کے قابل نہیں رہی اعلان کر دیا کہ ہم جا رہے ہیں۔ اور چلے گئے۔ تکئے پہ سر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔ مرید سمجھ رہے ہیں کہ سو گئے۔ یہ خبر ہی نہیں کہ اب وہ ابدی نیند میں ہیں۔ سبحان اللہ کیا اختیاری موت ہے۔ ایک ہم ہیں۔ موت کے کوچے میں بسر کرتے ہیں۔ مگر مرتے نہیں۔ یقین جانو ان گنہگار آنکھوں سے روز دو چار کو ٹھنڈا ہوتے دیکھتے ہیں۔ مگر کوئی گولی ادھر نہیں آتی۔ میاں ہوتا کیا ہے؟ گھر سے نکلتے ہیں تو گلی والے بتاتے ہیں کہ بس ابھی گولی چلنی بند ہوئی ہے۔ جب گھوم پھر کر گھر آ جاتے ہیں تو خبر ملتی ہے کہ گولی چلنی شروع ہو گئی۔ اور میاں کل کی سنو۔ میں تو مسجد میں جا کر نماز پڑھتا ہوں۔ کل مغرب کا ناغہ ہو گیا۔ اور کل ہی مسجد میں بم پھٹ گیا۔ ہماری محرومی پہ غور کرو مسجد میں مرتے تو شہادت کی موت میسر آتی۔ مگر کیسے میسر آتی۔ قدرت کو جو منظور نہیں تھا۔ پتہ نہیں کس طرح ہماری آنی لکھی ہے۔ پالنے والے عزت کے ساتھ لیجائیو۔"

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ بولنے کی بالکل خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی تھوڑی سی دلجوئی کے نقطہ نظر سے میں نے کہا "مرزا صاحب آخر جینے سے اتنی بھی بیزاری کیا!"

"ٹھیک کہتے ہو میاں۔ زندگی تو عطیہ خداوندی ہے۔ جتنی لے کے آئے ہو اسے صبر شکر کے ساتھ بسر کرو۔ شاد یا ناشاد بسر تو کرنی ہی ہے۔ مگر میاں ہم اپنے اندیشوں کو کہاں لے جائیں۔ آخر قدرت ہمیں کیا دیکھنے کے لئے زندہ رکھنا چاہتی ہے۔" رکے پھر بولے "جواد میاں ہماری دلی کہنے کو بائیس خواجہ کی چوکھٹ مگر سات دفعہ اجڑی ہے۔ اور سات دفعہ بسی ہے۔ چھٹی بار کا اجڑنا ہمارے پرکھوں نے دیکھا تھا۔ ساتویں بار کا اجڑنا ہم نے دیکھا۔ ہاں دیکھا اور سہا۔ ہم نے اماں بی کی اماں بی سے سنا تھا کہ جب غدر پڑا تھا تو بارہ بارہ کوس تک چراغ جلتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور دلی بس شہر بے چراغ۔ کتے بلی کی ریل پیل۔ آدمی کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہم سنتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ 47ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ میاں میں محلہ کو اچھا بھلا چھوڑ کر ذرا چاندنی چوک

KitaabPoint.blogspot.com

تک گیا تھا۔ جامع مسجد کے پاس سے گزرا۔ بازار جما ہوا تھا۔ سیڑھیوں پہ ویسا ہی ہجوم۔ بس ذرا ورہمی سی تھی۔ مگر میں نے اس وقت اس پہ دھیان نہیں دیا۔ چاندنی چوک میں قدم رکھا ہی تھا کہ بھگدڑ پڑ گئی۔ پوچھتا ہوں کہ یہ کیسی بھگدڑ ہے پر کوئی بتاتا ہی نہیں۔ خیر میں الٹے پیروں واپس ہولیا۔ جامع مسجد کے پاس سے جو گزرتا ہوں تو میاں یقین جاننا بالکل سناٹا۔ نہ دکاندار نہ خریدار نہ امام نہ نمازی۔ ہاں بالائی سیڑھی پر ایک پنجرا پڑا رہ گیا تھا جس میں ایک تیتر بری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا اور شور مچا رہا تھا۔ مجھے اس پہ ترس آیا مگر ایسے میں وہاں رکنا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ میں آگے بڑھ لیا۔ مگر میاں مجھ سے رہا نہ گیا۔ پلٹا' لپک کر سیڑھیاں چڑھا اور واں پہ جا کے پنجرے کی کھڑکی کھول دی۔ تیتر ایک دم سے نکلا اور پھر سے اڑ گیا۔ میں شتابی سے نیچے اترا اور گھر کی طرف چلا۔ محلہ میں قدم رکھا تو وہاں تو قیامت اٹھی ہوئی تھی۔ لوگ گھر چھوڑ چھوڑ بھاگ رہے تھے۔ میں نے ایک ایک سے پوچھا۔ جواب دینے کا کسے ہوش تھا۔ ایک بھلے ہمسائے نے بھاگتے بھاگتے کہا' مرزا صاحب حملہ ہونے والا ہے۔ بس نکل چلو۔ میں قدم مارتا اپنے گھر پہنچا۔ اہل خانہ سے کہا کہ بی چلو اٹھو۔ دلی سے ہمارا دانہ پانی اٹھ گیا۔ اب یاں جینے کا دھرم نہیں رہا۔ وہ بولیں' اے ہے کونسی قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم جدی پشتی یاں پہ بیٹھے ہیں۔ اٹھاؤ چولھا تھوڑا ہی ہیں کہ کپڑے جھاڑے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا کہ اے نیک بخت' قیامت ہی تو اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور دم کے دم میں پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ تو اس بی بی نے زمین پکڑی تھی اور میں غل مچا رہا تھا کہ کپڑے جھاڑو اور نکل چلو۔" رکے' بولے "سو میاں' ایسا وقت دیکھا ہے ہم نے۔ خدا ایسا وقت دشمن کو نہ دکھائے۔ پر میاں ہم نے تو دیکھا اور بھوگا۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ وہ ایسا ہی وقت تھا۔"

"اور پتہ ہے ہماری اہل خانہ نے کراچی آ کر پہلی شکایت کیا کی۔ اے ہے یاں پہ جمنا ندی تو ہے ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ نیک بخت' یاں سمندر ہے۔ کہا کہ اس بخت مارے سمندر کو دیکھ کے تو میرے دل میں ہولیں اٹھتیں ہیں۔" رکے۔ پھر بولے "مگر بھائی رفتہ رفتہ ہم نے اس سمندری شہر میں بسر کرنا سیکھ لیا۔ اب تم سوچ رہے ہو گے کہ مرزا گڑے مردے اکھاڑ رہا ہے۔ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔ ارے ہم نے تو مردے کو داب کے سو من مٹی اس پہ ڈال دی تھی۔ سب کچھ بھلا کے یاں بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر اب جانے کیوں وہ باتیں یاد آ رہی ہیں' جیسے ابھی کل کی بات ہو۔"

مرزا صاحب چپ ہو گئے۔ کتنی دیر تک چپ بیٹھے رہے۔ میں بھی چپ رہا۔ پھر افسردہ لہجہ میں بولے۔ "جواد میاں' یہ آج کی بات نہیں ہے۔ مسلمانوں نے کبھی اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ جب بہت دل دکھتا ہے تو میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ مرزا دلاور بیگ

KitaabPoint.blogspot.com

کس کی شکایت کرتے ہو۔ سوچو کہ تمہاری تاریخ میں کیا ہوتا رہا ہے۔ سچی بات ہے جواد میاں' ہم اپنی تاریخ کے ڈسے ہوئے ہیں۔ کسی سے نہیں ڈرتے ہم۔ بس اپنی تاریخ سے ڈرتے ہیں۔'' چپ ہوئے۔ پھر بڑبڑانے لگے۔ ''ایک ہمارے مولانا حالی تھے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ خوب مسدس لکھ گئے۔ ہمارے ابا حضور اسے پڑھ پڑھ کے رویا کرتے تھے۔''

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے۔

اس مقام پہ آ کے ان کی ہڑک بندھ جاتی تھی۔ یہ بندۂ درگاہ کہتا ہے کہ وہاں جا کے کیوں دیکھے۔ ادھر عبرت کا سامان کم ہے۔ مگر کوئی دیکھے بھی۔ کمبختوں کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔'' رکے۔ پھر بولے ''ویسے میں یہ نہیں کہتا کہ ادھر نہ دیکھے۔ ضرور دیکھے۔ وہ بھی تو ہماری ہی تاریخ ہے۔ اور کیا عبرت بھری تاریخ ہے۔'' لمبا ٹھنڈا سانس۔ ''جواد میاں عبرت' اگر کوئی حاصل کرے تو۔ میں کہتا ہوں اندلسی بہت بدنصیب تھے کیا عمارت کھڑی کی اور اپنے ہی ہاتھوں سے اسے ڈھا دیا۔''

مرزا صاحب رواں تھے اور مجھے وہ برس یاد آ رہے تھے جب میں مرزا صاحب کا مستقل سامع تھا۔ اپنی سارے سٹاف میں سے انہوں نے اپنے سامع کے طور پر جانے کیا دیکھ کر ایک مجھے چن لیا تھا۔ تاریخ کا یہ ورق تو انہیں ازبر تھا۔ دلی کے چھٹنے کا غم ابھی ان کے یہاں تازہ تھا۔ دلی کی عظمت رفتہ کا ذکر کس ولولہ اور کس حسرت سے کرتے تھے۔ اس ذکر میں قرطبہ اور غرناطہ کا حوالہ ہر پھر کر آتا تھا۔ اس حوالے کے ساتھ ہی زقند بھرنا اور اندلس میں نکل جانا۔ وہ غم جب ماند پڑ گیا تو یہ حوالہ بھی ان کے یہاں سے غائب ہو گیا۔ یا ممکن ہے آتا ہو میں ان سے اب ملتا کہاں تھا۔ اس دفتر کو سلام کرنے کے بعد ان سے ملنا تو کبھی کبھار ہی کا رہ گیا تھا۔ اور اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھ پہ مرزا صاحب ہی کا تو سایہ نہیں پڑ گیا۔ کمال ہے مجو بھائی کو تو تاڑ لینا چاہئے تھا۔ یہاں آ کر وہ بھی چوک گئے۔ مگر نہیں۔ فوراً ہی میں نے اپنے اس وہم کی تردید کر ڈالی۔ میں ان کے پرسوز بیانات سن لیتا تھا' متاثر بالکل نہیں ہوتا۔ بس جیسے اپنے دادا میاں کی باتیں سنتا تھا۔ مگر دادا میاں کی باتیں تو واقعی میں شوق سے سنتا تھا۔

''بھائی بندے علی' اندلسیوں کی تاریخ پڑھ کر بہت افسوس ہوتا ہے۔ عبرت کا دفتر ہے' عبرت کا دفتر۔''

''صحیح کہتے ہیں آپ۔''

''مگر بھائی بندے علی معجزے اس زمانے میں بہت ہوئے۔ کم نصیب مسلمان پھر بھی نہ سمجھے۔ ایک واقعہ تو کمال ہے۔''

بندے علی نے حقے کا گھونٹ لیا اور غور سے دادا میاں کو دیکھا ''وہ کیا واقعہ ہے۔''

''کہتے ہیں کہ جب مسلمانوں کی کتابیں جلائی جا رہی تھیں۔''

KitaabPoint.blogspot.com

''کتابیں بھی جلائی گئی تھیں۔انہوں نے کیا قصور کیا تھا۔''

''یہ قصور کم تھا کہ مسلمانوں نے انہیں لکھا تھا۔ بھائی بندے علی' باب الرملہ کے مقام پر دس لاکھ کتابوں کا ڈھیر لگا کے ان میں آگ لگا دی گئی۔ کہتے ہیں کہ ان میں کلام پاک کا بھی ایک نسخہ تھا۔''

''کلام پاک بھی جلایا گیا۔'' بندے علی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بدن میں رعشہ دوڑ گیا۔

''بھائی سنو تو سہی۔ جب سب کتابیں جل گئیں تو خلقت یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ایک کتاب راکھ کے ڈھیر میں پڑی الگ چمک رہی ہے۔ ذرا جو اس پہ آنچ آئی ہو۔ کھول کے جو دیکھا تو پتہ چلا کہ قرآن پاک ہے۔''

''سبحان اللہ' سبحان اللہ'' بندے علی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اور اسی کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ مرزا صاحب اگر ہمارے دادا میاں کے زمانے میں ہوتے تو ان سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی۔ بس وہ بھی بندے علی کے برابر بیٹھے حقہ پیتے اور سبحان اللہ' سبحان اللہ کا ورد کرتے نظر آتے۔ تو خیر آج زمانے بعد میں نے ان کی گفتگو میں یہ حوالہ دیکھا تھا۔ زمانے بعد ہی اس طرح اپنے مخصوص جذباتی لہجہ میں گفتگو کرتے دیکھا تھا۔ آج وہ اکیلے بھی تو تھے۔ اچھی بی کے سامنے ان کا چراغ کہاں جلتا تھا۔ اس وقت اچھی بی نہیں تھیں تو انہیں اپنے لئے کھلا میدان مل گیا تھا۔ پھر مجو بھائی بھی نہیں تھے۔ اکیلا میں تھا۔ ایسا خاموش سامع شاید زمانے بعد ہی انہیں میسر آیا تھا۔ ابھی وہ اٹھنے پہ مائل تو نظر نہیں آتے تھے۔ ابھی تو وہ اپنے اصل موضوع پر آئے تھے۔ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ یہی تو ان کا مرغوب موضوع تھا۔ اس تاریخ کے کتنے ورق انہیں ازبر تھے۔ مجھے تو ڈر کھائے جا رہا تھا کہ وہ کہیں مسدس سنانی شروع نہ کر دیں۔ مجھے تو پچھلا تجربہ یاد تھا مسدس کا ذکر آیا اور وہ ریشہ خطمی ہوئے۔ بس پھر شروع ہو جاتے تھے۔ کتنے بند زبانی یاد تھے۔ خیر ہوا یوں کہ بیچ بیچ میں میری آنکھیں مند جاتیں۔ اس سے شاید انہیں احساس ہو گیا کہ میں توجہ سے ان کی بات نہیں سن رہا یا شاید یہ احساس ہوا ہو کہ انہوں نے ایک مریض پر زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ ان کی شرافت تھی اور شائستگی کہ اس احساس کے بعد یعنی جو بھی انہیں احساس ہوا اس کے ساتھ ہی بس اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''اچھا عزیز' میں نے تمہاری بہت سمع خراشی کی۔ اب تم آرام کرو۔ میں چلتا ہوں۔''

''ارے مرزا صاحب بیٹھئے نا۔ زمانے بعد تو آپ ادھر آئے ہیں۔''

''نہیں عزیز۔ بس تمہاری خیریت معلوم کرنی تھی۔ گھر میں مجھے تکتکا رہی تھیں کہ جاؤ خیریت معلوم کرو اور مجھے بھی پریشانی تھی سو میں آ گیا۔ مریض کو زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہئے۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ شفا دینے والا اللہ ہے۔ ویسے بھی ماشاء اللہ اب تم

KitaabPoint.blogspot.com

روبصحت ہو۔'' تامل کیا۔ پھر بولے ''ہاں ایک بات ہے۔ دیکھو یہ جو مجو بھائی ہیں وہ ٹھہرے جلے پاؤں کی بلی۔ انہیں تو لپکا ہے مارے مارے پھرنے کا۔ جب تک چار گھر نہ جھانک لیں انکا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ بھلا یہ زمانہ یوں گھومنے پھرنے کا ہے۔ یہ تو وہ زمانہ ہے کہ آدمی بس منہ چھپا کر گھر میں بیٹھ جائے۔ تو اب عزیز تمہیں برا لگے یا اچھا بہرحال ہمارا تمہیں مشورہ یہ ہے کہ تم ذرا احتیاط برتو۔ آرام کرو۔ جب اچھے ہو جاؤ اور انشاء اللہ جلدی ہی اچھے ہو گے اس کے بعد بھی نکلنے سے ذرا احتراز کرو۔ باہر کچھ ہوتا رہے تمہاری بلا سے۔ اللہ نے فضل کیا' جان بچ گئی۔ ان بدبختوں نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان کے لئے کلاشنکوف طمنچہ ہے۔ چلانے میں کوئی باک ہی نہیں ہے۔ ارے ہم تو غلیل بھی اس بے تکلفی سے نہیں چلاتے تھے۔ غلے آخر کنکر پتھر تو نہیں تھے۔ انہیں تیار کرنے میں وقت لگتا تھا' محنت کرنی پڑتی تھی۔ تو یہ نہیں کہ کوئی گڑسل' کوئی چڑیا دیکھی اور فوراً غلہ داغ دیا۔ پہلے سوچنا پڑتا تھا۔ ان لوگوں کی طرح نہیں کہ آدمی ان کے لئے چڑیاں طوطے ہیں اور کارتوس کنکر پتھر' کمبختوں کے ہاتھوں میں کھجلی ہوتی رہتی ہے۔ آدمی انہیں نظر آ جائے۔ کمبخت پھر رکتے تھوڑا ہی ہیں۔ آدمی کی جان اتنی سستی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بس خدا بری گھڑی سے بچائے۔'' یہ کہتے کہتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ارے مرزا صاحب آپ تو واقعی جا رہے ہیں۔''

''ہاں میرے عزیز' تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ اور میرا معاملہ بھی یہ ہے کہ باہر ذرا دیر ہو جائے تو ہماری اہل خانہ کا دل ہو لنے لگتا ہے۔ وہ بھی سچی ہیں۔ میاں زمانہ ہی ایسا ہے۔ ہمارے ہمسائے کی سنو۔ لکھنو کے ہیں' سید زادے ہیں۔ انہیں صدر جانا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی لیتے چلنا۔ ذرا بینک جانا ہے۔ مقررہ وقت سے ذرا دیر سے پہنچے۔ بولے قبلہ معاف کیجئے' اماں حضرت نے امام ضامن باندھنے میں دیر کر دی۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیوں' کیا لمبے سفر پہ جا رہے ہو۔ کہا کہ نہیں۔ بس حضور کو بینک پہ اتارنا ہے۔ اور بندے کو صدر میں تھوڑا کام ہے۔ ہم نے پوچھا' پھر امام ضامن کس خوشی میں' بولے کہ جب سے حالات خراب ہوئے ہیں۔ اماں حضرت نے دستور یہ بنایا ہے کہ ہمارے دہلیز سے قدم نکالنے سے پہلے امام ضامن باندھتی ہیں اور کلام پاک کے نیچے سے ہمیں نکالتی ہیں۔ میں کہتا ہوں' بالکل ٹھیک کرتی ہیں۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔'' چلتے چلتے رکے۔ بولے ''میاں ہماری ایک بات یاد رکھو۔ ہماری تم سے زیادہ عمر ہے۔ ہم نے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ زمانے کے آثار اچھے نہیں ہیں۔ یہ مسلمان' خدا انہیں عقل دے' کمبخت اپنی تاریخ کو دہرانے پہ تلے ہیں۔'' یہ کہا اور تیزی سے نکل گئے۔

مرزا صاحب کے جانے کے بعد میں کتنی دیر تک آنکھیں موندے بے سدھ پڑا رہا۔ شاید باتیں سنتے سنتے تھک گیا تھا۔ مرزا

KitaabPoint.blogspot.com

صاحب لگاتار بولے تھے۔ نعمت خان یخنی لے کر آ گیا۔ پی کر بدن میں تھوڑی گرمی اور چستی آئی۔ مگر مرزا صاحب اپنی باتوں سے جو فضا پیدا کر گئے تھے۔ اس سے نکل نہیں پا رہا تھا۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ پھر اسی رو میں بہہ چلا ہوں۔ خیال یہ تھا کہ خدا خدا کر کے خلوت میسر آئی ہے۔ خود کو یکجا کروں گا اور جس رو میں بکھرا بکھرا بہہ رہا ہوں اس پہ بند باندھوں گا۔ مگر مرزا صاحب اپنی باتوں سے ایسا سماں باندھ گئے' ارے ایسا ویسا سماں' یوں دلی کے اجڑنے کا ذکر اڑتا اڑتا ہی سا کیا تھا۔ مگر یہی تو ماہر فنکاروں کا کمال ہوتا ہے کہ چند خطوط کھینچ کر پوری تصویر بنا دیتے ہیں۔ مختصر فقروں میں پوری پوری تاریخ۔ جس سے ڈرتے ہیں۔ عجب بات ہے' اچھی بی سمندر سے ڈرتی ہیں' مرزا دلاور بیگ تاریخ سے ڈرتے ہیں۔ کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے۔ اور اپنے کھنڈر' ہو حق کرتی جامع مسجد' سنسان سیڑھیاں' کہیں ایک سیڑھی پہ رکھا ہوا ایک پنجرہ' پنجرے میں پھڑ پھڑاتا شور کرتا تیتر۔ بارہ بارہ کوس تک نہ آدمی نہ چراغ کی روشنی۔ جہان آباد شہر بے چراغ۔ غرناطہ میں چراغ ابھی ٹمٹما رہا تھا۔ عبداللہ کا تندور بھی اسی طرح گرم تھا کہ نان سنک سنک کر نکل رہے تھے اور ان کی سوندھی سوندھی باس حرارت بھری فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔ مگر ابن حبیب پر کوئی اثر نہیں تھا نہ حرارت کا نہ سوندھی باس کا۔ گم متھان بیٹھا تھا۔ عبداللہ نے غور سے اس کی صورت دیکھی اور یوں بولا کہ ''اے یار عزیز' میں دیکھتا ہوں کہ آج تیرا طور کچھ بے طور ہے۔ میرے ہاتھ کپکپائے ہوئے نان کو بھی جسے کھا کر اہل غرناطہ ہونٹ چاٹتے ہیں تو نے آج یوں کھایا ہے جیسے وہ کوئی باسی روٹی ہے۔ اے عزیز' تیرے اس طور سے میں کیا سمجھوں۔ کچھ کہہ کہ تو آج اتنا پراگندہ خاطر کیوں ہے۔''

ابن حبیب نے تامل کیا۔ پھر بولا ''اے یار اب تو آئے دن ہی میں اس شہر میں ایسا کچھ دیکھتا ہوں کہ میری پراگندہ خاطری بڑھ جاتی ہے اور دل میں سو طرح کے اندیشے گزرتے ہیں۔ میں زمانے کے الٹ پھیر کو دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ یہ تیرا شہر ایک وقت میں میرے لئے آغوش مادر تھا اب خوف کا سمندر ہے۔ آج کا ماجرا سن۔ میں القیصر یہ سے گزر رہا تھا کہ ناگاہ ایک مرد درویش کہ مجذوب معلوم پڑتا تھا کسی سمت سے بلند آواز سے والا غالب الا غالب الا اللہ کا ورد کرتا نمودار ہوا۔ خیابان کے بیچ کھڑے ہو کر آسمان کی سمت نگاہ کی اور بولا جیسے اعلان کر رہا ہو کہ وتعز من تشاء وتزل من تشاء پھر تامل کر کے پکارا' افسوس' افسوس' افسوس۔ اس شاد آباد کوچہ کے دلال' دکاندار' ہزاری بزاری' سوار پیادے یہ سن ٹھٹھکے اور دم بخود رہ گئے۔ ایک بزرگ نے ہمت کر کے استفسار کیا کہ اے مرد حق آگاہ' تو کس بات پر افسوس کرتا ہے۔ مرد درویش نے غور سے اس بزرگ کو دیکھا۔ پھر بولا ''آگے کلام کی اجازت نہیں ہے۔'' اور آگے بڑھ لیا۔ میں نے تیزی سے اس کا تعاقب کیا۔ مگر وہ قریب ہی کی پتلی تلی ایسی گلی میں داخل ہوا اور چھلاوا بن گیا۔ میں نے اردگرد کی ساری گلیاں چھان ماریں۔ مگر وہ نہ ملا۔'' ابن حبیب چپ ہو گیا۔ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر افسردہ لہجہ میں بولا'' کسے

KitaabPoint.blogspot.com

ڈھونڈنے نکلا تھا اور کسے ڈھونڈنے لگا۔"

عبداللہ نے متجسس نظروں سے ابن حبیب کو دیکھا "اے یار یہ تو کیسی بات زبان پر لایا۔ تو کسے ڈھونڈنے نکلا تھا۔"

"اسے جسے میری نظریں سدا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔"

عبداللہ کا تجسس اس کلام سے اور زیادہ ہوا۔ "تیری نظریں کسے سدا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔"

ابن حبیب نے تامل کیا۔ پھر یوں گویا ہوا کہ "اے مرے یار جانی' اب تجھ سے کیا پردہ۔ جو زخم ابھی تک میں نے چھپا کر رکھا تھا وہ اب تجھے دکھاتا ہوں۔ وہ مہ لقا جس کا نام کلثوم ہے مرے دل کے نہاں خانے میں بسی ہے۔ بس یہ ترستی آنکھیں اسی کو ڈھونڈتی رہتی ہیں۔"

"کلثوم' کون کلثوم۔ کچھ بتا کہ وہ اس شہر جمیل کے کس کوچے میں رہتی ہے۔ اتا پتہ دے تو میں تیری جستجو میں تیری مدد کروں۔"

ابن حبیب نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "کاش وہ اس شہر میں ہوتی۔ وہ چاند مالقہ کی خاک سے ابھرا تھا۔ دل و جان سے میں اس پر فدا تھا۔ اس کے دیدار کی آرزو میں دن دن بھر اس معنبر کوچے کا طواف کرتا۔ جب دیدار ہو جاتا تو دنوں اس تصور سے سرشار رہتا۔ کیا سراپا تھا۔ بھاری کولھے' بھری گات' زلف سیاہ جیسے کالی گھٹا۔ چہرہ جیسے کالی گھٹا کے بیچ چودھویں کا چاند۔ مالقہ سے مجب خلقت سراسیمہ نکل رہی تھی اس ہنگام میں وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئی۔ پچھلے دنوں مجھے گمان سا ہوا کہ شاید وہ اسی شہر میں یہیں کہیں ہے۔ تب سے بیقرار پھرتا ہوں۔ کوچہ کوچہ اسے ڈھونڈتا ہوں۔"

عبداللہ سن کر بولا کہ "مجھے پہلے ہی شک ہوا تھا کہ میرا یار عزیز دل زدہ ہے اور مجھ سے کچھ چھپاتا ہے۔"

"آج بھی یہی کچھ ہوا۔ میں اس کی تلاش میں کوچہ کوچہ کی خاک چھانتا پھرتا تھا کہ اس مرد درویش سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ پھر میں اس کے تعاقب میں چلا۔ القیصریہ سے نکل زناقۃ الوری میں آیا۔ وہاں سے باب الرملہ کی طرف نکل گیا۔ وہاں پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔"

"وہ کیوں۔"

"پتہ نہیں۔ مگر جب بھی میرا گزر باب الرملہ کی طرف ہوتا ہے جانے کیا ہوتا ہے کہ میں ٹھٹھک جاتا ہوں۔ خیر تو میں باب الرملہ سے نکلا اور چلتا چلتا اتنی دور جا نکلا کہ مدینہ الحمرا کی برجیاں اور کنگرے نظر آنے لگے۔ اسی آن طائر کی وہی پراسرار پھڑ پھڑاہٹ جیسے بہت قریب سے آئی ہو۔ مجھے ایک خوف نے آلیا۔ فوراً ہی پلٹ لیا۔"

ابن حبیب خاموش ہو گیا۔ عبداللہ کہ خاموشی سے سن رہا تھا اسی طور خاموش رہا اور ساکت بیٹھا رہا۔ دیر بعد اس نے زبان کھولی

KitaabPoint.blogspot.com

اور یوں گویا ہوا ''اے ابن حبیب' خدا تیرے حال پہ رحم کرے' تیرے اندیشے سن سن کر میرے اندیشے جنہیں میں نے کوشش کر کے سلا دیا تھا جاگنے لگے ہیں۔ یہ ماجرا سن کر مجھے اہل بغداد سے سنی ایک روایت یاد آ گئی۔''

''عزیز' وہ کیا روایت ہے۔''

''اے یار' وہ روایت اس طرح ہے کہ ایک دن جب دونوں وقت مل رہے تھے۔ ایک ٹیڑھے پنجوں اور مڑی ہوئی چونچ والا سیاہ رنگ طائر بغداد کے آسمان پر اس طرح نمودار ہوا جیسے کالی بدلی آ گئی ہو۔ وہ قصر خلافت پر اترا اور سب سے اونچے کنگرے پر بیٹھ کر انسانی آواز میں پکارا۔ ''اے اہل بغداد۔'' تین مرتبہ وہ اس طرح پکارا جیسے خبردار کر رہا ہو اور نامعلوم سمت میں اڑ گیا۔ یہ پکار پورے بغداد میں سنائی دی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیسا پرندہ تھا اور کیسی اس کی پکار تھی۔ مگر سب دہل گئے۔ اور اس کے بعد جو ہوا کہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی وہ تو تو جانتا ہی ہے۔''

عبداللہ نے ٹھنڈا سانس لیا اور چپ ہو گیا۔ پھر دونوں ہی دیر تک چپ بیٹھے رہے اور تندور سے نکلتے شعلوں کو تکتے رہے۔ کتنی دیر تک وہ اسی طرح گم سم بیٹھے رہے تا آنکہ تندور کے بیچ دہکتے انگاروں پر راکھ جمتی چلی گئی اور بھوبھل دھیرے دھیرے کر کے ٹھنڈی ہو گئی۔ یہ دیکھ عبداللہ اور ابن حبیب دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل گئے۔

عبداللہ اور ابن حبیب تندور کے ٹھنڈا ہو جانے پر وہاں سے اٹھے تھے۔ مگر ان کے اندر جو ایک تندور پک رہا تھا۔ اس گرمی میں جس نے انہیں بیکل کر رکھا تھا وہ چلتے چلے جا رہے تھے۔ رات بھیگ چلی تھی۔ القصر یہ کی گلیاں اب خاموش تھیں۔ بڑے چوک میں بھی روشنیاں ماند ہوتی جا رہی تھیں۔ ساتھ میں چہل پہل بھی۔ عبداللہ اور ابن حبیب نے یہاں سے نکل کر باب الرملہ کی راہ لی۔ پھر رابطہ التوت سے گزر کر باب النبود کی طرف چلے۔ آگے مساجد الجوزہ تھی۔ اس طرف سے ہوتے ہوئے' حمام الجوزہ سے گزرتے ہوئے باب الوری کی سمت ہو لئے۔ لگتا تھا کہ آج کی شب وہ سارے غرناطہ کو کھوند ڈالیں گے۔ چلتے چلتے جب تک تھک گئے تو فج الوزہ کے قریب جا کر ٹھٹھکے۔ ''اے عزیز' اب میری ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔'' اور یہ کہتے کہتے عبداللہ ایک حوض کے کنارے سنگ مرمر کی شفاف نشست پر ایسے بیٹھا جیسے ڈھیر ہو گیا ہو۔

ابن حبیب بھی قریب آ کر بیٹھ گیا اور بولا ''تو نے صحیح کہا۔ آج ہم نے لمبا گشت کیا ہے۔ میری ٹانگیں شل ہو چکی ہیں۔ مگر عجب بات ہے کہ دل اسی طرح بیکل ہے اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔''

''جانے رات کی یہ کونسی گھڑی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ رات ڈھلنی شروع ہو گئی ہے۔'' یہ کہتے کہتے عبداللہ نے آسمان پر نظر ڈالی

KitaabPoint.blogspot.com

جہاں دور تک پھیلے ستارے جھلمل جھلمل کر رہے" لگتا ہے کہ پورے مدینہ الغرناطہ میں اس ساعت صرف دو نفوس بیدار ہیں اور بیکل۔ باقی سب محوِ خواب ہیں۔"

"اے عزیز عبداللہ۔" ابن حبیب سوچتے ہوئے بولا" مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ تو بہت کچھ جانتا اور سمجھتا ہے مگر جانے کس باعث اپنے لب سی لئے ہیں۔ یا شاید تو مجھے اس کا اہل نہیں جانتا۔"

تسپر عبداللہ یوں لب کشا ہوا۔" اے مرے یار عزیز' تو نے غلط قیاس کیا۔ میرے پاس بتانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ میں اگر جانتا ہوں تو بس اتنا کہ ایک وقت کشتیاں جلانے کا ہوتا ہے اور ایک وقت کشتی بنانے کا۔ وہ وقت پیچھے رہ گیا جب ہم سے اگلوں نے ساحل پر اتر کر سمندر کی طرف پشت کر لی تھی اور اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ اب بپھرتا سمندر ہمارے پیچھے نہیں' ہمارے سامنے ہے اور ہم نے کوئی کشتی نہیں بنائی۔"

ابن حبیب یہ سن کر رویا اور بولا کہ" اے یار' میں نے صبح جانا تھا کہ تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور اے کاش میں یہ جاننے کی کوشش نہ کرتا کہ تو کیا جانتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ جب بھی تو زبان کھولتا ہے میں دہل جاتا ہوں' اے عبداللہ جان کے کہ میں ایک خوفزدہ روح ہوں۔ تیری باتیں سن کر میں زیادہ خوفزدہ ہو گیا ہوں۔ اب مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ طائر یہیں کہیں اڑ رہا ہے بس اچانک کسی گھڑی۔۔۔۔۔۔"

"صاب جی' کھانا لاؤں۔"

"کیا۔" میں نے بڑبڑا کے نعمت خان کو دیکھا۔

اصل میں مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب نعمت خاں آیا۔ پہلے بھی وہ بہت آہستگی سے کمرے میں داخل ہوتا تھا اور اب شاید میرے آرام کے خیال سے وہ زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ دبے قدموں کمرے میں داخل ہوتا جیسے بتاشوں پہ چل رہا ہے تو پتہ نہیں کس وقت وہ دبے قدموں آ کر میرے پلنگ کے برابر آن کھڑا ہوا تھا۔

"کھانا.....اچھا تیار ہو گیا.....ہاں لے آؤ۔"

نعمت خان کی بات کا جواب دینے کے لئے مجھے کتنی دور سے واپس آنا پڑا۔ مگر واپس آ کر بھی شاید واپس نہیں آیا تھا۔ کھانا کھا ضرور رہا تھا مگر اس طرح کہ میکانکی انداز میں نوالہ منہ میں جاتا اور منہ چلنے لگتا۔ ادھر منہ چل رہا تھا' ادھر اندر چکی سی چل رہی تھی۔ منہ اپنا کام کر رہا تھا' بھٹکتا دھیان اپنا کام کر رہا تھا۔ بس یوں سمجھو کہ اندر بیٹھا دھنیا پھر اپنے کام سے لگ گیا تھا۔ دھنک دھنک روئی دھنی